<?xml version="1.0" ?>			
<?xml-stylesheet type="text/css" href="home.css"?>			
<Doc id="urd-w-media-	UR00083	"	lang="Urdu">
<Header type="text">			
<encodingDesc>			
<projectDesc>	CIIL-Urdu Corpora, Monolingual Written Text		</projectDesc>
<samplingDesc>	Simple written text only has been transcribed. Diagrams, pictures, tables and verses have been omitted. Samples taken from page 24-25,54-55,72-73,100-101,132-133,158-159,190-191,214-215,242-243,264-265		</samplingDesc>
</encodingDesc>			
<sourceDesc> <biblStruct> <source>		NTS	
	<category>	Aesthetics	</category>
	<subcategory>	Literature-Criticism	</subcategory>
	<text>	Book	</text>
	<title>	اردو ادب کی تاریخ	</title>
	<vol>		</vol>
	<issue>		</issue>
</source>			
<textDes>			
	<type>		</type>
	<headline>		</headline>
	<author>	عظیم الحق جنیدی	</author>
	<translator>		</translator >
	<words>	5,141	</words>
</textDes>			
<imprint>			
	<pubPlace>	India- Aligarh	</pubPlace>
	<publisher>	ایجوکیشنل بک ہاؤس	</publisher>
	<pubDate>	2006	</pubDate>
</imprint>			
<idno type="CIIL code">		1005	</idno>
<index>		UR00083	</index>
</biblStruct> </sourceDesc>			

<profileDesc> <creation>			
	<date>	23-Oct-2007	</date>
	<inputter>	Ayesha	</inputter>
	<proof>	Ayesha, Shahnawaz Alam	</proof>
</creation>			
<langUsage>		Urdu	</langUsage>
<wsdUsage>			
<writingSystem id="ISO/IEC 10646">Universal Multiple-Octet Coded Character Set (UCS). </writingSystem>			
</wsdUsage>			
<textClass>			
<channel mode="w">		print	</channel>
<domain type="public">			</domain>
</textClass> </profileDesc> </Header>			
<text><body>			

<p>	اگر اس کو ثقافتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک قومی سانحہ تھا۔ انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں جو بیرونی حملہ آور آئے تھے، وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے یہیں شادی بیاہ کیے، یہیں کی زبان اور بولیاں سکھیں اور یہاں کی آبادی میں اس طرح گھل مل گئے گویا کہ اس کے نتیجہ میں ایک نئے کلچر کی بنیاد پڑی جس کی ایک دین اردو زبان ہے۔	</p>
<p>	اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی کشتی حالات کے طوفانوں میں ڈگمگارہی تھی سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس کو ڈوب جانے سے محفوظ رکھا اِس جماعت کی نظر سیاست، تعلیم، مذہب، معاشرتی اصلاح، زبان و ادب کی ترقی سب پر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر قوم کو زندہ رہنا ہے تو وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا ہوگا اور اس قوم کو مغرب کی تہذیب اور روایات میں جو ایسے عناصر تھے جو اس قوم کے مسائل کے حل میں مدد دے سکتے تھے ان کو قبول کرلیا جائے یہی سرسید کی تحریک تھی۔ اس کی بنیاد	</p>

	فراخ دلی اور عقلیت پر تھی اور اس کی ترویج کے لیے انھوں نے تہذیب لاخلاق رسالہ جاری کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی جو آج مسلم یونیورسٹی ہے۔ اپنی تحریروں اور رسالوں کے ذریعہ روایت پرستی کے خلاف مقصدی اور مفید ادب کی تخلیق کی جس نے اردو زبان وادب، شاعری وتنقید کا رخ ہی بدل دیا۔ ان کے رفقاء میں محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی قابل ذکر ہیں۔ یہ زمانہ ۱۹۱۴ء تک کا ہے۔ اس تحریک نے اردو شعراء اور مصنفین کو نیا ادبی نقطۂ نظر دیا۔ موضوعات کو وسعت بخشی اور بیان کی سلاست اور سادگی پر زور دیا۔ مندرجۂ بالا رفقائے سرسید کے علاوہ وقار الملک، ذکاء اللہ محسن الملک، سید علی بلگرامی نے گھسے پٹے موضوعات کو ترک کرکے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت کے موضوعات کی طرف توجہ کی۔	
<p>	برصغیر کی اصلاحی اور تعمیری تحریکات میں اخباروں اور رسالوں نے بڑا حصہ لیا۔ ان میں مولوی محمد باقر کے "اردو اخبار" کے علاوہ "محب وطن"، "صادق الاخبار" اور "کوہِ نور" وغیرہ اخبارات و رسائل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا نام لینا بھی ضروری ہے اس لئے کہ اس اخبار نے پہلی مرتبہ قوم کے لفظ کے بارے میں لکھا کہ ایک خاص ملک میں رہنے والوں کو ایک قوم شمار کیا جائے۔	</p>
<p>	اسی زمانے میں انگریزوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر ایک نئے نظام تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے جدید مغربی علوم وفنون اور زبان وادب کے مطالعے کی راہ پیدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی بیداری بھی عام ہوئی اور آہستہ آہستہ ان تحریکوں نے ہندوستانیوں کے دماغ کو متاثر کرنا شروع کیا اور جس کے نتیجہ میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس کا مطالبہ صرف حکومت میں	</p>

	ہندوستانیوں سے امور حکومت میں مشورہ لینا تھا۔ اس کے بعد "ہوم رول" کا مطالبہ شروع ہوا اور اس اہم دور میں عدم تعاون، سودیشی تحریک اور پھر سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ ان سب میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں حکومت اور سیاسی کارکنوں میں ٹکراؤ ہوا اور جلیانوالہ باغ کا وہ حادثہ پیش آیا جو انگریزوں کے دامن حکومت پر ایسا بدنما داغ ہے جو قیامت تک نہ چھٹ سکے گا۔	
<p>	رام پور اسکول دلّی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز بنا اور شاہانِ اودھ کی قدردانی اور سرپرستی نے اردو کو نئی زندگی دی۔ یہ البتہ درست ہے کہ لکھنؤ کی اس زمانے کی شاعری بے راہ روی کا شکار ہوگئی۔ دہلی کے آخری تاجدار سلطنتِ مغلیہ بہادر شاہ ظفرؔ بھی شاعر تھے۔ وہ جلا وطن کئے گئے۔ لکھنؤ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ اخترؔ بھی شاعر تھے اور وہ بھی لکھنؤ نہ رہ سکے لیکن دونوں تاجداروں نے شعراء کی سرپرستی کی اور زبان و شاعری کی جو خدمت دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے کی وہ انھیں کی فیاضانہ نوازشوں کا نتیجہ تھی۔	</p>
<p>	غدر کے بعد دہلی کا دربار تباہ اور اطمینان کی فضا ختم ہوئی تو لکھنؤ کی وزارت نے شعراء کے لیے آغوش سرپرستی وا کر دیا۔ لیکن اودھ کی سلطنت کے ختم ہونے کے بعد شعراء منتشر ہوگئے اور ان کی سرپرستی کے لیے صرف چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہ گئیں۔	</p>
<p>	ان ریاستوں میں رام پور کو باوجود ایک چھوٹی سی سلطنت ہونے کے اپنے حکمرانوں کی علم دوستی اور سرپرستی کی بنا پر ممتاز مقام حاصل ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی بربادی کے بعد شعراء نے رام پور کی آغوش میں پناہ لی۔ وہاں کے نواب یوسف علی خاں ناظم خود شاعر تھے اور مومنؔ و غالبؔ کی اصلاحوں نے ان کے کلام میں پختگی اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ ان کی یہ مشہور اور مسلسل غزل آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔	</p>

	میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط مٹھی میں کیا دھری تھی جو چپکے سے سونپ دی جانِ عزیز پیش کش نامہ بر غلط ان کے دربار میں لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ یک جا ہوئے اور ان کے سنگم سے ایک نئے اسکول کی بنیاد پڑی۔ ان کے جانشین نواب کلب علی خاں نوآب بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی سرپرستی میں اس اسکول نے ترقی کی۔	
<p>	دہلی اسکول کے نمایندے داغ اور تسلیم تھے اور لکھنؤ کے بحر، جلاَل اور امیر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئے طرز تغزل کی بنیاد پڑی جس میں دونوں اسکولوں کی خوبیاں جمع ہوگئیں۔ شعرائے لکھنؤ نے رعایت لفظی اور محض قافیہ پیمائی کو ترک کیا اور دہلی کی سادگی اور معنی آفرینی کی طرف توجہ کی۔ یوں عامیانہ پن اور ابتذال کا خاتمہ ہوا۔	</p>
<p>	اس اسکول کے مقتدر اور ممتاز نمایندے داَغ دہلوی اور امیر مینائی تھے۔	</p>
<p>	اردو زبان و ادب کی ترقی میں بہار کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ آج بھی اروزبان اس علاقے میں فروغ پارہی ہے اور پہلے بھی یہاں اردو کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ پروفیسر سید حسن عسکری نے حضرت شرف الدین یحیٰی منیری کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ۹۱۱ھ (۱۵۱۵ء) میں لکھا گیا۔ اس کی نقل منیر شریف کی درگاہ میں موجود ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اردو زبان کی سب سے پرانی تحریر یہی ہو۔	</p>
<p>	سید عمادالدین عماَد نے ایک نثری رسالہ "سید ھاراستہ "۱۰۸۱ھ(۱۶۷۰ء عیسوی) میں تصنیف کیا۔ قاضی عبدالودود نے اسے شایع کردیا ہے۔ اس طرح یہ رسالہ شمالی کی اردو نثر کا سب سے پہلا نمونہ قرار پاتا ہے۔	</p>
<p>	شاعری میں بھی یہی صورت ہے۔ بعض ایسے شاعروں کے نام بھی ملتے ہیں جو محمد شاہ بادشاہ کے جلوس سے پہلے سے اردو میں شاعری کررہے تھے۔ ان میں عماد اور بی	</p>

	بی دلیہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ عہد محمد شاہ بادشاہ کے شعراء میں ملاّ محمد علیم تحقیقؔ عظیم آبادی کا نام اہم ہے۔ یہ میرزا موسوی خاں معزؔ و فطرتؔ کے شاگرد تھے عظیم آباد میں ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۷۴۹ء میں وفات پائی۔ کلام کے رنگ کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوگا۔	
<p>	سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دھا ہے دیکھا ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں میرے چندھا ہے یہاں ایک اور شاعر کا ذکر ضروری ہے۔ میر محمد باقر حزیں وظہورؔ تھے جو میرزا جان جاناں مظہرؔ کے شاگرد تھے۔ یہ احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دہلی سے پورب گئے اور وہاں اپنے استاد کے رنگ سخن کو عام کیا۔ ان کے شاگردوں نے بھی خاصا نام پیدا کیا، ان میں سے ایک شورؔش بھی تھے جنھوں نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا۔	</p>
<p>	فقیہہ صاحب دردمند نے بھی کچھ عرصے عظیم آباد میں قیام کیا تھا۔ یہ بھی مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ان کا ساقی نامہ قدیم اردو شاعری میں اہمیت رکھتا ہے۔	</p>
<p>	اردو شاعری کے دبستانوں میں عظیم آباد کو بھی بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اس کی اہمیت مسلم ہوچکی تھی اور بعض دیگر مقامات کی طرح اسے بھی اردو شاعروں کی پناہ گاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں اردو کے جو شاعر یہاں داد سخن دے رہے تھے یہاں ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔	</p>
<p>	**موزوںؔ** موزوںؔ کا نام رام نراین تھا۔ موضع کشن پور کے رہنے والے تھے۔ عمر کے آخری حصّے میں بہار کے نائب ناظم تھے، اس لیے راجہ کہلاتے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں	</p>

	میں شاعری کرتے تھے۔	
<p>	**مومنؔ** محمد مومن خاں نام، مومنؔ تخلص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی کی تعلیم مولانا شاہ عبدالقادر سے حاصل کی، طب اپنے والد سے پڑھی۔ پیشہ طبابت ہی تھا۔ علم نجوم میں بڑی مہارت بہم پہنچالی تھی۔ اکثر حساب لگا کے پیش گوئی کرتے جو صحیح ہوتی۔ شاعری شروع کی تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن کچھ ہی دنوں کی مشق کے بعد اصلاح سے بے نیاز ہوگئے اور اپنے مذاق سخن کو ہی اپنا رہبر بنایا۔	</p>
<p>	غزل اپنے اصل معنی میں عورتوں سے گفتگو یا عورتوں کے بارے میں گفتگو ہے۔ یعنی اس میں حسن و عشق کی باتیں بیان کی جاتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور زندگی کے تمام موضوعات اس میں داخل ہوگئے لیکن مومنؔ کا زیادہ تر کلام حسن و عشق ہی کے گرد گھومتا ہے۔ گویا انھوں نے اپنی غزل کا دائرہ محدود کردیا لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اسی محدود دائرے میں انھوں نے جدتیں پیدا کی ہیں اور اسی کی جزئیات کو ایسی عمدگی کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ نہ اس کے شعروں میں پستی پیدا ہوتی ہے اور نہ یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔	</p>
<p>	ممکن ہے مومن کی اس خصوصیت کا سبب یہ ہو کہ انھوں نے زندگی میں واقعتاً عشق کیا تھا اور ایک پردہ نشین خاتون کو جو شاعرہ تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی، چاہا تھا۔ ان کے کلام میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے شعروں میں اصلیت کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور جذبات کی شدت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ مختصر	</p>

	یہ کہ انھوں نے عاشقانہ مضامین دلکش انداز میں پیش کیے ہیں کہ قدم قدم پر شگفتگی کا احساس ہوتا ہے اور کلام میں وہ تغزل پیدا ہوگیا ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوا۔ ان کے تشبیہات و استعارات ان کی سلیقہ مندی کے گواہ ہیں۔ نازک خیالی اور مضموں آفرینی کلام مومنؔ کی اہم خصوصیت ہے۔	
<p>	مومنؔ نے اپنی شاعری میں ایک اچھوتے انداز کی بنیاد ڈالی اور وہ انداز ہے اپنی بات کہنے کا ایک خاص ڈھنگ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اکثر وہ اپنے محبوب سے کوئی بات اس طرح کہتے ہیں جیسے اسی کے بھلے کی کہہ رہے ہوں اور اس بات میں محبوب ہی کا فائدہ مدنظر ہو لیکن گہرائی میں جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف انداز تھا، فائدہ اپنا ہی مقصود ہے۔ ایک بار اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم محفل میں چوری چوری میرے رقیبوں کو دیکھ تو رہے ہو لیکن اس سے تمھاری بدنامی ہوگی۔ اگر تمھیں یہ گوارا ہے تو شوق سے ان کی طرف دیکھو۔	</p>
<p>	**اقبالؔ (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)** شیخ محمد اقبال نام، اقبالؔ تخلص۔ ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان کشمیر سے ترک وطن کرکے آباد ہوگیا تھا۔ مشن کالج سیالکوٹ میں مولوی سید میر حسن جو عربی اور فارسی کے استاد تھے، مشرقی علوم حاصل کیے۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد اورنیٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفے کے پروفیسر رہے۔ اسی زمانے میں پروفیسر آرنلڈ سے بھی فیض اٹھایا۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے جہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور جرمنی سے ایرانی تصوف کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ وطن واپس آکر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے مگر یہ کام ان کی طبیعت کے خلاف	</p>

	تھا اس لیے جلد اس سے الگ ہوگئے۔ ۱۹۳۸ء میں طویل بیماری کے بعد رحلت پائی۔	
<p>	اقبال نے اپنی شاعری کے پہلے دور کا آغاز اپنی مشہور نظم "نالہ یتیم" سے کیا۔ اس دور کی دوسری اہم نظمیں ہیں ہمالہ، نیاشوالہ اور ترانۂ ہندی وغیرہ۔ گویا اس زمانے میں ہندوستان اور ہندوستان کی محبت ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ اس وقت ان کی زندگی میں حب الوطنی یعنی اپنے دیس کی محبت کا جذبہ اپنے شباب پر تھا۔	</p>
<p>	قیام انگلستان کا زمانہ اقبال کی زندگی میں ایک اہم موڑ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں رہ کر انھیں اندازہ ہواکہ وطن پرستی کا بت بڑا ہلاکت خیز ہے اور اس کے مقابلے میں وہ ایک عالمگیر اسلامی نظام کا خواب دیکھنے اور مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگے۔	</p>
<p>	اقبال کے بزرگ بت پرست تھے جس کی طرف انھوں نے خود بھی اشارہ کیا ہے: میں اصل کا خاص سومناتی آبا مرے لاتی و مناتی لات اور منات دو بتوں کا نام ہے۔ گویا دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہواکہ میرے بزرگ بتُ پرست تھے لیکن اقبالؔ نے اسلام کی وہ خدمت کی کہ مسلمان ہمیشہ ان کے احسان تلے دبے رہیں گے۔ اقبال نے قرآن پاک کا مطالعہ بڑی توجہ سے کیا تھا اور جب انھوں نے ملّی شاعری کی طرف توجہ کی تو قرآن کی تعلیم اور قرآن کے پیغام ہی کو عام کیا۔	</p>
<p>	اقبالؔ نے مسلمانوں کی پستی کے سبب تلاش کیے تو معلوم ہواکہ وہ بے عمل ہوگئے۔ اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گئے۔ ان میں قسمت کا یہ غلط تصور عام ہوگیا۔ تھاکہ جو کچھ مقدر میں پہلے سے لکھا ہے وہی ہوکے رہے گا اور جب ایسا یقین ہوتو انسان کوشش اور	</p>

	عمل کیوں کرنے لگا۔ مسلمانوں نے یہ بے عملی صوفیوں سے بھی سیکھی تھی جو فلسفۂ وحدت الوجود کی تعلیم دیتے تھے اور دنیا کو حقیر بتاتے تھے۔ انسان ان کے نزدیک بالکل بے حقیقت تھا۔	
<p>	اس کے جواب میں اقبالؔ نے یہ کہا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، حاصل کائنات ہے اور نائب خدا ہے۔ خدا نے کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے اور انسان کو اپنے لیے بنایا ہے۔ جب ایسا ہے تو انسان بے حقیقت کیسے ہوسکتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اصلیت کو سمجھے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا پتہ چلائے۔ اسی کو وہ احساسِ خودی یا عرفانِ ذات کا نام دیتے ہیں۔ انسان اپنی خودی سے واقف ہو جائے تو اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا۔ اقبالؔ کہتے ہیں: خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے	</p>
<p>	اقبالؔ کہتے ہیں جب انسان کو خودی کا احساس ہو جائے یعنی اسے اپنی پوشیدہ قوتوں کا علم ہو جائے تو پھر وہ انھیں مضبوط کرے۔ اسے اقبالؔ "استحکام خودی" کا نام دیتے ہیں۔	</p>
<p>	اردو شاعری کے دور جدید کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر اس تحریک کا ذکر نہ کیا جائے جس نے اردو شاعری کو بڑی شدّت سے متاثر کیا۔	</p>
<p>	ترقی پسند تحریک کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا کے مشہور مصنفین اور شعراء شریک تھے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمایندگی سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے کی۔ یہ دونوں اس زمانہ میں لندن میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے یہ لوگ لندن میں ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن بنا	</p>

	چکے تھے اور اس انجمن نے ترقی پسند مصنفوں اور شاعروں کی رہنمائی کے لیے اپنے مقاصد کو ایک طویل اعلان کے ذریعے سے شایع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں اس انجمن کا اجلاس ہوا۔ اس کے اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنس عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جن سے خاندان، مذہب، جنس، رنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔"	
<p>	اس تحریک میں جن ادیبوں اور شاعروں نے حصّہ لیا ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: پریم چند، جوش، مجنوںؔ گورکھپوری، فیض، مجازؔ، کرشن چندر، جاں نثار اختر، اختر رائے پوری، علی سردار جعفری، جذبیؔ، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سید سجاد ظہیر، سلام مچھلی شہری مخدومؔ الدین وغیرہ۔ اس تحریک سے پہلے بھی ادب کو سماجی مسائل کا ذریعہ بنانے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ سرسید نے جو نیا ادبی شعور دیا تھا اس نے بھی سائنسی عقلیت اور سماجی شعور کو ادب کا ایک اہم موضوع بنا دیا تھا۔ اس تحریک نے شعراء اور مصنفین کو خیال اور مضمون کی اہمیت کی طرف توجہ دینے پر زور دیا تھا۔ سرسید کے مقالات، حالی کی قومی شاعری، نذیر احمد کے ناول، شبلیؔ کے مضامین اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔	</p>
<p>	ترقی پسند شعراء اور مصنفین نے سیاسی انقلاب کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ جاگیرداری، سرمایہ	</p>

	داری، معاشی اور اقتصادی استحصال، بھوک، افلاس اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف جنگ کی جائے۔ انھوں نے اشتراکیت کو اس کا حل بتایا اور اسی کا پرچار کیا۔ حالانکہ یہ حل اس ملک کے ماحول اور تہذیبی روایات کے خلاف تھا۔ یہ لوگ بغاوت کے علمبر دار تھے۔ اس بغاوت میں وہ مذہب اور قدیم اخلاقی اقدار سے آزادی کا مطالبہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور افسانوں کے ذریعے ایک مزدور انقلاب کی بشارت دی۔	
<p>	ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا تو انگریزوں کے قدم جمنے لگے اور ملک کا بڑا حصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آگیا۔ ملک کا انتظام کرنے کے لیے آئے دن انگلستان سے انگریز افسر آتے رہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی تھی کہ وہ اس ملک کی کسی زبان سے واقف نہ ہوتے تھے اور یہاں کے باشندے بالکل انگریزی نہ جانتے تھے۔ حاکم و محکوم ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھیں تو ملک کا کاروبار چلے کیسے؟	</p>
<p>	آخر کار کلکتہ میں ایک کالج فورٹ ولیم کالج کے نام سے ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ نووارد انگریز افسروں کو یہاں کی زبان سکھائی جائے۔ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اردو عام بول چال کی زبان تھی اور سارے ملک پر چھاتی جارہی تھی۔ فارسی اس زبان کے لیے جگہ خالی کررہی تھی۔ اس لیے کالج میں اردو کا شعبہ بھی قایم کیا گیا جس کی سربراہی جان گلگرسٹ کو سونپی گئی۔	</p>
<p>	کالج کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کتب خانہ اور پریس بھی قایم کیا گیا تھا اور اردو کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔	</p>
<p>	جب پڑھانے کی نوبت آئی تو اندازہ ہوا کہ ایسی کتابیں ہی موجود نہیں جن کو نصاب میں	</p>

	داخل کیا جا سکے۔ اس لیے کتابیں لکھوانے کی ضرورت پیش آئی اور سارے ملک سے اہل قلم کو اکٹھا کیا گیا جو ترجمے کر سکیں اور کتابیں لکھ سکیں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ چونکہ یہ کالج نووارد انگریز افسروں کو زبان سکھانے کے لیے قایم ہوا ہے اس لیے کتابوں کی زبان بہت سادہ اور آسان ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس کالج کے طفیل اردو زبان کو فضول عبارت آرائی، لفاظی اور مقفی و مسجع عبارت سے نجات ملی اور صاف سلیس زبان لکھنے کا رواج ہوا۔	
<p>	جو اہل قلم اس کالج میں تصنیف و ترجمے کے کام پر مامور تھے ان میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔	</p>
<p>	جان گلگرسٹ، میر امن، میر شیر علی افسوس، سید حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، مرزا کاظم علی جواں، نہال چند لاہوری، مظہر علی خان ولاؔ، مولوی اکرام علی، بینی نراین جہاں، مرزا علی لطف، مولوی امانت اللہ، مرزا جان طپش، سید حمید الدین بہاری۔ ان اہل قلم کا حال الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔	</p>
<p>	یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ کالج تقریباً بیس برس قایم رہا اور اس عرصے میں اردو کے اٹھارہ مصنفین اور مترجمین نے تقریباً پچاس کتابیں اردو میں تصنیف یا ترجمہ کیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے کالج پر خرچ ہونے والی رقم کو غیر ضروری خرچ خیال کر کے اسے بند کر دیا۔ اگر یہ ادارہ قایم رہتا تو اردو کے فروغ میں اس سے اور بھی زیادہ مدد ملتی۔	</p>
<p>	**اردو نثر کا عہد زریں** ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد زمانے کا ورق پلٹا۔ پرانی بساط اٹھی اور نئی بچھ گئی۔ ایک تہذیب نے دم توڑ دیا اور دوسری قدم جمانے لگی۔ عیش و عشرت	</p>

	کے دن خواب و خیال ہوگئے۔ آخر نیند کے ماتے بھی آنکھیں ملتے اٹھنے لگے۔ ہندوستانی قوم نے نئے حاکموں کے طور طریقوں پر غور سے نظر کی اور پھر اپنے سرمایے پر نظر ڈالی تو سب کچھ ہیچ سا نظر آیا۔ خاص طور پر ادب کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اپنے یہاں صرف خیالی باتیں ہیں۔ سرسید ہمارے پہلے بزرگ ادیب ہیں جنھیں سب سے پہلے یہ خیال ہوا کہ ادب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب کی ضرورت ہے۔ دھن کے پکّے تھے۔ جس کام میں لگ گئے لگ گئے۔ انھوں نے ادب کی کایا پلٹ کردینے کا بیڑا اٹھایا۔	
<p>	**سرسید احمد خاں** ایک تنقید نگار نے لکھا ہے کہ "سرسید کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سوتوں کو جھنجھوڑا، قوم کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا، اسے جذبۂ فکر و عمل سے روشناس کیا اور مختصر یہ کہ اسے ادبار سے نکالا۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی خامیوں اور خوبیوں کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور مصلحانہ کوششوں سے ان کی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان کی یہ رہنمایانہ کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہ رہیں بلکہ انھوں نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت۔۔ ہندوستانی مسلمانوں کے جملہ مسائل پر توجہ کی۔ اگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک شعبے پر مرکوز کردیا ہوتا تو شاید اس میں سب سے بڑا ماہر ہونے کا اعزاز پایا ہوتا۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو یقیناً ان کی ذات سے وہ فائدہ نہ پہنچا ہوتا جو موجودہ صورت میں پہنچا۔ اگر سرسید صرف قرآن و حدیث کی طرف توجہ کرتے تو بلند پایہ عالمانِ دین میں ان کا شمار ہوتا، رشد و ہدایت دینے خانقاہ	</p>

	مین بیٹھ جاتے تو ایک عالم ان سے فیض پاتا۔ اگر سیاسی رہنمائی پر اکتفا کرتے تو اس میدان میں قوم کے کارواں سالار ہوتے۔ اگر صرف مسائل تعلیم پر غور کرتے تو دنیا کے مشہور ماہرین تعلیم کی صف میں جگہ پاتے۔ اگر شاعری کرتے تو غالؔب و اقباؔل کے ہم پلہّ ہوتے مگرہ وہ تخصیص کا راستہ اختیار نہ کرسکتے تھے کیوں کہ وہ پیدا ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کو پستی وزبوں حالی سے نکالنے کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے ماہر طبیب کی ضرورت تھی جس کے پاس ہر مرض کا علاج ہو اور ہر درد کا مداوا ہو۔ چنانچہ سرسید نے اپنے دائرہ کار کو محدود نہیں کیا۔ پھر بھی وہ کون سا میدان تھا جس میں وہ قیادت کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا وہ کون شا شعبہ ہے جو سرسید کے احسان سے گراں بار نہ ہو۔۔ انھوں نے بے عملوں کو جہد و عمل کا درس دیا، تنہا نشینوں کو خلوت سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھلائی۔ محض اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کیا۔ تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے آگاہ کیا اور غور و فکر تجزیہ واستدلال کی ضرورت سے باخبر کیا۔	
<p>	اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے وسط میں ہوا اور پریم چند نے پہلی بار افسانے کے فن پر توجہ کی۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں دو موضوعات خاص طور سے پیش کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب، اس کی روایات اور اعلی اخلاقی اقدار۔ ان کے افسانوں میں "ماضی کی عظمت اور روحانی صفات کی محبت ملتی ہے۔" ان میں سیاسی اور قومی شعور کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ دیہاتی زندگی کا تفصیلی نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے کے	</p>

	دیہات کی زندگی سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کا بڑا خیال رکھا ہے۔ یہی حقیقت نگاری ان کے افسانوں کے کرداروں میں بھی ملتی ہے۔ پریم چند کے افسانے اردو افسانے کے ارتقاء میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مکالموں میں کرداروں کی شخصیت کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔	
<p>	ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں دوسرا نام سلطان حیدر جوش کا ہے۔ ان کے ہاں مزاح کی لطافت بھی ہے اور طنز کی زہرناکی بھی۔ زبان و بیان نہایت لطیف ہے۔ ان کے افسانوں کے انداز اور اسلوب بیان میں مقصدیت نمایاں نہیں ہوتی۔	</p>
<p>	ابتدائی دور میں بعض رومانی افسانے لکھے گئے۔ ان افسانہ نگاروں میں نیاز فتحوری سجاد حیدر یلدرم اور حجاب امتیاز علی قابل ذکر ہیں۔	</p>
<p>	نیاز فتحوری کے افسانوں میں سکون کم اور اضطراب و ہیجان زیادہ ہوتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اردو میں انشائے لطیف کے علمبردار ہیں۔ ان کے رومانی افسانوں میں ہیجان اور اضطراب کم، سکون اور خاموشی زیادہ ملتی ہے۔ انھوں نے اردو میں ترکی سے بہت سے خیالات اور اسالیب بھی منتقل کیے۔	</p>
<p>	حجاب اپنے افسانوں میں پلاٹ یا کردار سے زیادہ توجہ ایک سحرانگیز بلکہ سحرزدہ فضا پیدا کرنے میں صرف کرتی ہیں۔	</p>
<p>	اردو میں انگریزی سے بہت سے افسانے ترجمہ ہوئے۔ اسی زبان کے واسطہ سے روسی اور فرانسیسی زبان کے افسانے بھی اردو میں آئے اور ان کے ذریعہ سے مغربی موضوعات، اسالیب اور تکنیک سے اردو افسانہ کو تعارف حاصل ہوا۔	</p>
<p>	اس ابتدائی دور کے بعد افسانہ معیار اور مقدار کے اعتبار سے برابر ترقی کرتا رہا۔ پطرس بخاری کے افسانوں میں مغربی ذہن کی جھلک ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع	</p>

	ہے۔ ان کی ذہانت، بذلہ سنجی اور لطیف طنز نے افسانوں میں ایک ہلکی پھلکی فضا پیدا کردی ہے۔	
<p>	عظیم بیگ چغتائی نے تفریحی افسانے زیادہ لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ وہ اس ظرافت کو افسانہ کی فضا اور واقعات سے پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں کی ذہنی سطح زیادہ بلند نہیں۔	</p>
<p>	جیسا کہ کہا جاچکا ہے ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی۔ اس رجحان کا اظہار افسانوں کے مجموعے "انگارے" میں ملتا ہے۔ ان افسانوں کا موضوع حقیقی زندگی کا بے باکی اور جرأت سے اظہار ہے۔ ان افسانوں کے لکھنے والے سماج سے باغی نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماج کی فلاح و بقا کا دار و مدار رجعت پسندی کے خلاف بغاوت اور بغاوت کے بے باکانہ اظہار پر منحصر ہے۔ لیکن اظہار اور جسارت کی بعض حدود مقرر ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ان حدود کا احترام نہیں کیا ہے۔ انگارے کے مصنفین سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمودالظفر ہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد افسانہ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔	</p>
<p>	تاریخی اعتبار سے حالی سے باقاعدہ تنقید کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی مشہور تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" بہت اہم ہے۔ شعر و شاعری کے ماحول کے بارے میں اردو میں پہلی مرتبہ انھوں نے شاعری اور سوسائٹی کے تعلق کی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں کہ شاعری سوسائٹی کو خراب کرتی ہے بلکہ بری سوسائٹی خود شاعر اور شاعری کو خراب کرتی ہے۔ اچھا شاعر ہونے کے لئے حالؔی نے تین شرطیں بتائی ہیں۔ تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ۔ اچھے شعر کے لئے بھی تین صفات بتائی ہی۔ سادگی، اصلیت اور جوش۔ حالؔی نے ایک اہم بحث	</p>

	شاعری میں وزن، ردیف اور قافیے کی اہمیت پر بھی کی ہے اور پہلی مرتبہ ردیف اور قوافی کی سختیوں اور وزن کی پابندیوں میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ حالؔی کی تنقید کا ایک اور اہم پہلو ادب کے بارے میں ان کا مقصدی اور اصلاحی نقطہ نظر ہے۔ حالی نے اردو شاعری کی مختلف اصناف پر بہت کھل کر تنقید کی ہے۔ خاص طور سے غزل پر سخت تنقید کی ہے۔ حالؔی کی تنقید سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغرب سے متاثر ہیں۔ انھوں نے مغربی تنقید کے بعض اصولوں کو اردو میں روشناس بھی کرایا ہے لیکن وہ مغرب سے مرعوب نہیں ہیں۔ اور مشرقی اصول تنقید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔	
<p>	مولانا شبلؔی کے مضامین کے علاوہ ان کے تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت "شعرالعجم" اور "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" سے ہوتی ہے۔ عربی اور فارسی نے ان کے تنقیدی تصورات کو متاثر کیا ہے۔ بعض باتیں جدید تنقید کی ان کے یہاں بھی ملتی ہیں مثلاً ملکی ماحول، طبعی حالات اور خاص تہذیب و معاشرت کا اثر جو شعر و ادب ب پڑتا ہے۔ موازنہ انیسؔ و دبیرؔراز تنقید سائنٹفک نہیں ہے کیوں کہ ان دونوں مزاج اور افتاد طبع کے فرق کی وجہ سے ایک سطح پر دونوں کا موازنہ نہیں ہوسکتا۔ بہر حال شبلؔی اردو کے پہلے رومانی نقاؔد ہیں اور تنقید کو رومانی رنگ و آہنگ سے آشنا کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔	</p>
<p>	مولانا محمد حسین آزاد بھی اس زمانے کے ممتاز نقاد ہیں۔ خاص طور پر آب حیات میں ان کے تنقیدی نظریات کا سراغ ملتا ہے۔ سخندان فارس کو پڑھنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری پر ماحول کے اثر اور شاعری کی افادی حیثیت اور اہمیت سے واقف تھے۔ آب حیات کی اہمیت یہ ہے کہ اردو تذکروں کے انداز سے ہٹ کر ادبی تاریخ اور یہ پہلا نمونہ ہے۔ تحقیق البتہ ان کی کمزور ہے۔ ان کے یہاں بعض واقعاتی غلطیاں راہ پاگئی ہیں۔ ان کا تنقیدی پہلو زیادہ تر عملی تنقید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ	</p>

	بلاشبہ تاثراتی انداز رکھتا ہے۔ انشاء پردازی کے زور میں وہ ایسے فقرے بھی لکھ جاتے جن سے تنقید، تنقید نہیں رہتی۔ یہی ان کی تنقید کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔	
<p>	غرض حالیؔ، آزادؔ اور شبلیؔ گو، جدید اردو تنقید کے نصب ہیں۔ ان کے معاصرین اور متبعین نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اس کے بعد اہم نتائج برآمد ہوئے مثلاً اس سے پہلے تذکرہ نویسی کا جو انداز تھا وہ تقریباً متروک ہوگیا۔ اس کے بعد اردو تنقید نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ اس نثر میں نواب امداد امام اثر کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کی کتاب کاشف الحقایق المعروف بہ "بہارستان سخن" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے مشرق و مغرب، قدیم و جدید شعرا کے بکثرت نمونے تھے اور وہ بعض نقادوں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ان کے نزدیک شاعر کے لیے فطرت کا اتباع ضروری ہے۔ اسی لئے انھوں نے شاعری کو فطری اور غیر فطری میں تقسیم کیا ہے اور نقاد کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ اس کی معلومات وسیع ہوں۔ بقول ان کے "شعر فہمی حکیم کا کام ہے"۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف اور شعراء کے کلام پر تنقید کی ہے۔	</p>

</body></text>
</Doc>